درس ۵

اقامتِ دین کی جدّوجہد کرنے والی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی اور تنظیمی اساس

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعدُ :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡۤا اَنۡصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ لِلۡحَوَارِیّٖنَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ فَاٰمَنَتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَ کَفَرَتۡ طَّآئِفَۃٌ ۚ فَاَیَّدۡنَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلٰی عَدُوِّہِمۡ فَاَصۡبَحُوۡا ظٰہِرِیۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ (الصّف)

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ.......... الآیۃ﴾ (الفتح:۲۹)

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ وَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۱۱﴾﴾ (التوبۃ)

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰہَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۱۰﴾﴾ (الفتح)

﴿لَقَدۡ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ یُبَایِعُوۡنَکَ تَحۡتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ فَاَنۡزَلَ السَّکِیۡنَۃَ عَلَیۡہِمۡ وَ اَثَابَہُمۡ فَتۡحًا قَرِیۡبًا ﴿۱۸﴾﴾ (الفتح)

﴿یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الۡمُؤۡمِنٰتُ یُبَایِعۡنَکَ عَلٰۤی اَنۡ لَّا یُشۡرِکۡنَ بِاللّٰہِ شَیۡئًا وَّ لَا یَسۡرِقۡنَ وَ لَا یَزۡنِیۡنَ وَ لَا یَقۡتُلۡنَ اَوۡلَادَہُنَّ وَ لَا یَاۡتِیۡنَ بِبُہۡتَانٍ یَّفۡتَرِیۡنَہٗ بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِنَّ وَ اَرۡجُلِہِنَّ وَ لَا یَعۡصِیۡنَکَ فِیۡ مَعۡرُوۡفٍ فَبَایِعۡہُنَّ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لَہُنَّ اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲﴾﴾ (المُمتحنۃ) ...... صدق اللّٰہ العظیم

وَعَنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ : بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا، لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ (۱)

وفی روایۃ : وَ اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللّٰہِ فِیْہِ بُرْھَانٌ (۲)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناس۔ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمھا فی المعصیۃ۔ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ سترون بعدی اموراً تنکرونھا ۔ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ......

قرآن مجید کے اس سلسلۂ درس میں ہم قرآن حکیم کی کچھ اُن آیات اور اُن مقامات کا مطالعہ کر رہے ہیں جن میں اُس ہیئت اجتماعیہ کے مختلف پہلوؤں کے ضمن میں رہنمائی وارد ہوئی ہے جو اقامتِ دین، غلبۂ دین یا تکبیر ربّ کی جدوجہد کے لیے قائم ہو۔ اس اجتماعیت کا ایک پہلو ہمارے سامنے آ چکا ہے کہ اس میں جو لوگ شریک ہوں ان کے مابین کیا رشتۂ اخوت، کیسا رشتۂ محبت اور کس نوعیت کی نسبتِ ولایت درکار ہے۔ اب اس اجتماعیت کی اصل جڑ اور بنیاد کے بارے میں ہمیں غور وفکر کرنا ہے اور وہ ہے اس کا ایک ڈسپلن، یعنی نظم جماعت۔ اس نظم جماعت کے وجود میں آنے کی اساس، اس کی بنیاد، اس کی جڑ کیا ہو؟ ڈسپلن کے حوالے سے ایک نسبت امیر اور مأمور کے مابین قائم ہوتی ہے۔ امیر اور مأمور کی یہ نسبت اسلام میں دو طرح سے وجود میں آتی ہے۔ ایک تو ہیئت سیاسیہ کے ضمن میں، جب حکومت کی تشکیل ہوتی ہے کہ جو بھی والیٔ امر یعنی والیٔ حکومت یا

مسلمانوں کا امیر ہے اس کے اور اس ریاست کے شہریوں کے مابین ایک نسبت ہے۔ اور اس کی ایک دوسری صورت اس جماعت کے نظم کے اعتبار سے ہے جو اقامت دین کی جدوجہد کے لیے قائم ہو' یعنی اس کے امیر اور وہ لوگ جو اِس جدوجہد میں شریک ہیں ان کے مابین امیر اور مأمور کی ایک نسبت قائم ہوتی ہے۔ اس وقت ہم درحقیقت اس دوسری نوعیت کی نسبت کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔

اس کے ضمن میں سورۃ الصّف کی آخری آیت میں ہمیں ایک رہنمائی مل چکی ہے کہ یہ نسبت کیسے وجود میں آتی ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ اٹھ کر ایک آواز لگاتا ہے۔ جب تک نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری تھا وہ نبی یا رسول ہوتا تھا' وہ لوگوں کو پکارتا تھا' وہ مأمور من اللہ بن کر آتا تھا' اور اس کے ساتھ علیحدہ سے کوئی عہد کرنا اور دستوری رشتے میں منسلک ہونا ضروری نہیں تھا' بلکہ محض اس پر ایمان لے آنے سے وہ نسبت وجود میں آ جاتی تھی۔ البتہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں جس ایثار و قربانی اور جس طرح تن من دھن لگانے کا ایک تقاضا ابھرتا تھا اس کے حوالے سے ان کے مابین ایک صورت یہ بھی ہوتی تھی کہ وقت کا نبی یا وقت کا رسول کسی وقت خاص طور پر ایک صدا لگاتا تھا کہ: مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؟ ''کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟'' چنانچہ یہ الفاظ جب سورۂ آل عمران (آیت ۵۲) میں آئے ہیں تو وہاں اس سے پہلے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ﴾ یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کی طرف سے کفر کی شدت کا احساس کیا۔ معلوم ہوا کہ اب مقابلہ شدید ہونے والا ہے' اب ایک تصادم کی صورت پیدا ہونے والی ہے ﴿قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط﴾ تو انہوں نے ایک صدا لگائی کہ کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟ ﴿قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ج اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ج﴾ حواریوں نے اس کا جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار! ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک نسبت ان کے مابین قائم ہو چکی تھی اور وہ نسبت درحقیقت ایمان کی نسبت تھی کہ حضرت عیسیٰؑ نے نبوت کا دعویٰ کیا' جنہوں نے ان کی تصدیق کی وہ ان کے ساتھی بن گئے' وہ فطری طور پر اُن کے تابع ہو گئے اور منطقی طور پر اُن پر حضرت عیسیٰؑ کی اطاعت واجب ہو گئی۔ لیکن جب وہ مرحلہ آیا جبکہ محسوس ہوا کہ اب شدید کشمکش کا آغاز ہونے والا ہے تو انہوں نے خاص طور پر ایک ندا لگائی ''مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؟'' جس کا ایک مثبت جواب اُن کے حواریوں نے دیا۔ بہرحال اس سے ہمیں رہنمائی ملی کہ اس جدوجہد کے لیے کسی ہیئت اجتماعیہ کے وجود میں آنے کی صورت یہ ہے کہ کوئی داعی یہ صدا لگائے' لوگوں کو پکارے' اور جو لوگ اس کی اس پکار پر لبیک کہہ کر حاضر ہو جائیں وہ اس کے ساتھی اور اعوان و انصار ہوں گے۔

اسی جانب مزید رہنمائی ہمیں سورۃ الفتح کی آخری آیت سے ملی' جس کے بارے میں کئی بار گفتگو ہو چکی ہے کہ یہی اجتماعیت جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں وجود میں آئی تو ذہن میں رکھئے کہ اس کے بھی دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ کہ جس نے بھی تصدیق کی حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کی وہ فطری طور پر آپؐ کا ساتھی بن گیا۔ کیسے ممکن تھا کہ حضور ﷺ حکم دیں اور وہ اسے تسلیم نہ کرے! یہ تو اس کا ایک منطقی نتیجہ ہے اور ایک ایسی اظہر من الشّمس بات ہے کہ جس کے لیے کسی اضافی قول و قرار اور کسی اضافی عہد و میثاق کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جو ہیئت اجتماعیہ وجود میں آئی اس کے اجزائے ترکیبی یہی ہیں کہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ﴾ یعنی ''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں'' یا ''اللہ کے رسول محمد (ﷺ)''۔ یہ میں بحث کر چکا ہوں کہ یہ دونوں نحوی ترکیبیں یہاں ممکن ہیں' لیکن یہاں اہم بات یہ ہے کہ ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ﴾ ''اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں''۔ یہ ہیں کہ جنہوں نے ان کی رفاقت اور معیت اختیار کی ہے' جو اُن پر ایمان لائے ہیں' ان کی تصدیق کی ہے' اور اب یہ مل کر جب ایک ہیئت اجتماعیہ کی شکل اختیار کرتے ہیں تو ان کے مابین ایک نسبت امیر اور مأمور کی بھی قائم ہوتی ہے۔ ایک نسبت تو بنیادی ہے رسول اور اُمتی کی' اس پر یہ اضافی نسبت ہے امیر اور مأمور کی۔

اس اضافی نسبت کو نمایاں کرنے والی چیز جو ہمیں قرآن اور سنت اور سیرتِ رسول ﷺ سے ملتی ہے' اس کا عنوان ''بیعت'' ہے۔ اب اس بیعت کے سلسلے میں ہمیں سمجھنا ہے کہ اس کی اصل کیا ہے' جڑ بنیاد کیا ہے' اس کا معنی و مفہوم کیا ہے' قرآن حکیم میں بیعت کا ذکر کہاں کہاں آیا ہے' بیعت کی کتنی انواع و اقسام ہیں' سیرت النبیؐ میں اس بیعت کا کس تدریج کے ساتھ ذکر ملتا ہے؟ میں کوشش کروں گا کہ یہ سب باتیں ایک تدریج کے ساتھ مختصر ترین وقت میں آپ کے سامنے آ جائیں۔ اس ضمن میں تفصیلی مباحث میری بہت سی تقاریر میں موجود ہیں' لیکن جامعیت کے ساتھ ایک مختصر وقت میں ان مباحث کا سامنے آ جانا اِن شاء اللہ بہت مفید ہو گا۔

بیعت کی حقیقت ۔ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ کی روشنی میں

اس بیعت کی اصل حقیقت پر جو آیۂ مبارکہ روشنی ڈالتی ہے وہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ ہے۔ بیعت کے حروفِ اصلی ''ب' ی' ع'' ہیں اور بیع و شراء کے معنی خرید و فروخت کے ہیں۔ اور یہ ذہن میں رکھئے کہ جب تک کرنسی وجود میں نہیں آئی تھی تو خرید و فروخت اصلاً مبادلۂ اشیاء کا نام تھا۔ مبادلۂ اشیاء میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیز اُس دوسری چیز کی قیمت ہے' اور برعکس بھی کہا جا سکتا ہے کہ نہیں' یہ دوسری چیز اُس پہلی چیز کی قیمت ہے۔ دونوں ہی شے بھی ہیں اور دونوں ہی قیمتیں بھی ہیں۔ البتہ عربی زبان مین بیع اور شراء کے دوطرفہ الفاظ کا استعمال موجود ہے۔ اس اعتبار سے شراء کے معنی ہو جائیں گے بیچنا' جبکہ بابِ افتعال سے ''اِشْتِـرَاء'' خریدنے کے معنی میں آئے گا۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد

ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط﴾ (آیت ۲۰۷) ''لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو بیچتے ہیں اپنی جانیں اللہ کی رضا کی تلاش میں''۔ یہاں شَرٰی ' یَشْرِی بیچنے کے معنی میں آیا ہے اور سورۃ التوبۃ میں ''اِشْتَرٰی'' (باب افتعال) خریدنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح لفظ بیع غالب استعمال کے اعتبار سے فروخت کرنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ بائع (بیچنے والا) اور مشتری (خریدار) کے الفاظ ہمارے ہاں عام طور پر مستعمل ہیں۔ بائع وہ ہے جو بیچ رہا ہے' لیکن جب یہ باب تفاعل یا باب مفاعلہ میں آئے گا تو اِن دونوں ابواب میں ایک خاصہ تو اضافی مبادلے کا پیدا ہو جاتا ہے اور ان کا دوسرا خاصہ دو فریقوں کے مابین کسی دو طرفہ معاملے کا وجود میں آنا ہے۔ جیسے جہد سے مجاہدہ اور قتل سے مقاتلہ ہے اسی طرح باب مفاعلہ میں بیع سے مبایعہ ہوا۔ اب مبایعہ میں جب دو فریق شریک ہو جائیں گے تو پھر وہی اشیاء کے مبادلے کی صورت بن جائے گی۔ اور اس دور میں چونکہ کرنسی ایک علیحدہ شے معین ہو گئی ہے تو کرنسی سے کسی شے کا مبادلہ ہے۔ بہر حال قرآن مجید میں یہ بیع کا لفظ تو کثرت سے آیا ہے' لیکن سورۃ البقرۃ میں باب تفاعل سے ''تَبَایَعْتُمْ'' بھی آیا ہے۔ اور یہاں آپ دیکھیں گے کہ ''مبایعہ' باب مفاعلہ سے بھی وارد ہوا ہے۔ تو یہ درحقیقت مبادلہ ہے' جس کے لیے ہماری زبان میں سادہ ترین لفظ ''لین دین'' ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ ایک تو نقد بیع ہے' یعنی چیزوں کا باہمی تبادلہ ہو گیا یا کرنسی سے کسی شے کا مبادلہ ہو گیا' اور ایک ہے مستقبل کے اعتبار سے کوئی سودا کرنا۔ اس صورت میں ذرا اضافی پیچیدگی (complication) آتی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں لفظ ''تَبَایَعْتُمْ'' اسی مفہوم میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ ص﴾ (آیت ۲۸۲) ''اور جب کوئی سودا کیا کرو (جو فی الفور نہیں ہو رہا ہے) تو ضرور گواہ بنا لیا کرو''۔ اس لیے کہ یہ ایک معاہدہ ہے۔ اس کی بحث ہمارے ہاں فقہ میں ''بیع سَلَم'' کے عنوان سے آتی ہے۔ بیع سَلَم وہ ہے جس میں کوئی مستقبل کا سودا ہو رہا ہے۔ مستقبل کی بیع کو اسلام عام طور پر discourage کرتا ہے' اس لیے کہ اس میں کئی پیچیدگیاں ہیں اور کسی نہ کسی طور سے سود کا عنصر داخل ہو جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا اصلاً تو اسلام چاہتا ہے کہ سودا نقد ہوا کرے۔ بیع کی بہترین صورت تو وہی ہے' البتہ انسانی تمدن کے تحت یہ ضرورت بھی پیش آتی ہے کہ کسی وقت کوئی ادھار سودا بھی ہو۔ اسلام نے اس کی صرف ایک شکل کو جائز رکھا ہے کہ مبادلے کے جو دو رُخ ہیں ان میں سے ایک شے بتمام وکمال اُسی وقت ادا ہو جائے۔ مثلاً آپ کو ماہِ مئی کے لیے گندم کا کوئی سودا کرنا ہے کہ دس ہزار من گندم دو سو روپے من کے حساب سے کوئی خریدر ہا ہے اور کوئی بیچنے کا عہد کر رہا ہے تو اس گندم کی جو کل قیمت بنتی ہے وہ خریدار کے لیے اسی وقت ادا کر دینا لازم ہے' جبکہ اسے گندم ماہِ مئی میں ملے گی۔ یہ بیع سَلَم کہلاتی ہے۔ اور یہ ہے درحقیقت وہ ''مبایعت'' یا ''تبایع'' کہ اس میں ایک سودا ہو رہا ہے لیکن بیع فی الفور مکمل نہیں ہوئی' مبادلۂ اشیاء اسی وقت نہیں ہوا۔

ان چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک بات اور نوٹ کر لیں کہ عربوں کے ہاں جب اس مبایعت یا تبایع کا معاملہ ہوتا تھا تو چونکہ یہ بات قول وقرار کے درجے میں ہوتی تھی' لہٰذا اس کو پختہ کرنے کے لیے ہاتھ ملانا ان کے ہاں ایک علامت کے طور پر رائج تھا کہ بات پختہ ہو گئی۔ ہوتے ہوتے اس کا استعمال نقد خرید وفروخت پر بھی ہونے لگا کہ جب کوئی سودا طے ہو جاتا اور بات پوری ہو جاتی تو اس پر بھی وہ مصافحہ کرتے۔ یہ ہاتھ کا ملا لینا درحقیقت اُس وقت اِس بات کی علامت ہوتا تھا کہ اب بات پوری ہو گئی' سودا طے ہو گیا' جو ردّ وقدح اور بحث وتمحیص ہونی تھی وہ ہو چکی۔

اب دیکھئے کہ قرآن حکیم اس بیع کا ذکر کن اسالیب میں کرتا ہے۔ قرآن مجید کسی حقیقت کی توضیح کے لیے مختلف اسلوب اختیار کرتا ہے۔ جہاں تک تجارت اور خاص طور پر اس بیع وشراء کا معاملہ ہے' اسے ہر انسان سمجھتا ہے۔ عامی سے عامی اور اَن پڑھ سے اَن پڑھ انسان بھی اس سے نابلد نہیں۔ یہ وہ بنیادی تصورات (concepts) ہیں کہ جن سے کوئی شخص ناواقف نہیں۔ چنانچہ دیکھئے سورۃ الصّف میں اللہ تعالیٰ نے یہی الفاظ استعمال کیے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾﴾

''اے اہل ایمان! کیا میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟''

تجارت میں ہوتا کیا ہے؟ کچھ سرمایۂ تھوڑا یا کم اور کچھ محنت۔ اور اس سرمائے اور محنت کے لگانے سے مطلوب ایک نفع اور فائدہ ہوتا ہے۔ تین چیزیں اس کے لازمی اجزاء ہیں۔ چنانچہ یہاں وہ نفع سامنے رکھا گیا کہ عذاب الیم سے چھٹکارا پانا! اس عظیم نفع کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ تجارت کرنی پڑے گی۔ اور جیسے تم تجارت میں سرمایہ بھی لگاتے ہو اور محنت بھی کرتے ہو اسی طرح اس تجارت میں بھی سرمایہ اور محنت دونوں لگیں گے۔ وہ تجارت ہے کیا؟

﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ط ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾

''ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے (اس میں اپنے مال بھی کھپاؤ اور اپنی جانیں بھی)۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو''۔

اب یہ وہ اسلوب ہے کہ جس کو عامی سے عامی انسان بھی سمجھ جائے گا۔ اس لیے کہ ان تصورات کو سمجھنے کے لیے فلسفہ و منطق پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ انسانی معاملات کے بنیادی تصورات ہیں جن کو ہر انسان جانتا ہے۔ ابھی میں نے سورۃ البقرۃ کی ایک آیت آپ کو سنائی: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط﴾ (آیت ۲۰۷) یعنی لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی جانیں بیچتے ہیں' اپنی صلاحیتیں' اپنی توانائیاں' اپنی قوتیں' اپنے اوقات بیچتے ہیں۔ کس لیے؟ اللہ کی رضا جوئی کے لیے۔ یہی انداز ایک حدیث میں آیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَايِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا))(۱) یعنی ہر انسان جب صبح کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بیچنا شروع کرتا ہے۔ وہ کہیں کسی دفتر میں اپنی صلاحیتوں کو کھپا رہا ہے' اپنا وقت صرف کر رہا ہے' کہیں کسی کھیت میں محنت کر رہا ہے' اپنی توانائیاں کھپا رہا ہے' اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہے۔ شام تک وہ اپنے آپ کو بیچ رہا ہوتا ہے۔ البتہ اس کا نتیجہ مختلف نکلتا ہے۔ اپنے نفس کے بیچنے والے ایک وہ ہیں جو شام کو گھر لوٹتے ہیں تو گناہوں کی گٹھڑی بھی ساتھ لے کر آتے ہیں' اپنے نفس کو تباہ و برباد کر کے لوٹتے ہیں' اس کے لیے جہنم کا پروانہ حاصل کر کے واپس آتے ہیں۔ اور ایک وہ ہیں جو جہنم سے رہائی کا پروانہ لے کر آتے ہیں۔ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا۔ وہ بھی ہیں جو گردن کو چھڑا کر لاتے ہیں اور وہ بھی ہیں کہ جو اِس کو ہلاکت کے حوالے کر کے آتے ہیں۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الطهارة' باب فضل الوضوء۔ وسنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللهﷺ' باب منه۔

دین کی اس کلی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے وہی انداز سورۃ التوبۃ میں اختیار کیا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط﴾ ''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہل ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی بسبب اس کے کہ ان کے لیے جنت ہے''۔ یعنی اللہ نے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ اب آپ یہ جان لیجیے کہ یہ بیع سَلَم ہوگی۔ یہ مبادلہ یہاں نہیں ہو رہا۔ جنت تو آخرت میں ملے گی' جبکہ جان و مال یہاں حوالے کرنے ہوں گے۔ ایسی خرید و فروخت کو بیع سَلَم اسی لیے کہتے ہیں کہ ایک شے فوری طور پر سپرد کر دی جاتی ہے۔ لفظ تسلیم ہم اردو میں بھی سپرد کر دینے اور حوالگی کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ تو ''بیع'' کا ایک طرف کا پہلو اگر مکمل حوالہ ہو جائے' اس کی تسلیم ہو چکے' وہ بیع سَلَم ہے۔ اب اس کا جو بھی دوسرا عوض ہے وہ کسی وقت معینہ پر ملے گا۔ اسی طرح کی ایک مبایعت یا تبایع کا معاملہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کے مابین ہوا۔

اب اس بیع کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ کیا ہے: ﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ قف﴾ ''وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں' پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں''۔ وہ جان جو اللہ کو دے چکے' اب وہ اس کو کھپا رہے ہیں' لگا رہے ہیں اللہ کے راستے میں۔ نوٹ کیجیے کہ یہاں قتال کا لفظ آیا ہے جو خاص ہے' جبکہ جہاد عام ہے' تو جہاں خاص کا ذکر آئے گا وہاں عام خود بخود اس میں شامل سمجھا جائے گا' جیسے ہر رسول تو نبی ہے ہی' ہر نبی رسول نہیں ہے' لہٰذا جہاں لفظ رسول آ جائے وہاں نبوت مقدر (understood) ہے' اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں بھی خاص اور آخری بات ''قتال'' کا ذکر ہو گیا' جہاد اس میں بدرجۂ اُولیٰ مراد ہے۔ اب وہ اس جہاد اور ''قتال'' میں اپنی جانیں بھی کھپا رہے ہیں' اپنے مال بھی کھپا رہے ہیں۔ ''جہاد'' کی طرح ''قتال'' بھی جان اور مال دونوں کو محیط ہے۔ انسان کے پاس سب سے قیمتی متاع جان ہے' جب وہ اس کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں حاضر ہو جاتا ہے تو بر سبیل تغلیب یہاں ازخود مال بھی مراد ہو گیا۔ لہٰذا قتال میں جہاد بالمال والنفس گویا کہ یہاں پورا کا پورا مندرج ہے' understood ہے۔

سلسلۂ جہاد و قتال کے ضمن میں آخری شے کا ذکر کیا جا رہا ہے اور ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق باقی ساری چیزیں اس میں ازخود مذکور ہو گئیں۔ ﴿فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ ''وہ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں''۔ جان کا سودا تو پہلے کر چکے' اب تو صرف اس کی حوالگی باقی تھی' سو وہ بھی ہو چکی۔

اللہ تعالیٰ کی اہل ایمان سے بیع و شراء بیع سَلَم ہے' ایک ادھار سودا ہے کہ جان و مال تو یہاں سپرد کر دیے ہیں اور جنت کا وعدہ آخرت میں ہے اور ادھار سودے پر انسان کے دل میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ تردّد پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ ادھار تو ہے بھی اتنا بڑا ادھار کہ یہاں صرف سالوں اور مہینوں کا مسئلہ نہیں' ایک عالَم اور دوسرے عالَم کا فرق ہے۔ اگرچہ اِس عالَم سے اُس عالَم میں منتقلی اسی وقت فی الفور بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں وقت لگ جائے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ابھی اس دنیا میں مزید کتنا عرصہ رکھنا اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے فیصلے میں ہے۔ لہٰذا اس ادھار سودے پر طبیعت میں ایک اضطراب اور تردّد کا پیدا ہونا طبعی اور فطری ہے۔ اور پھر یہ وہ چیز ہے کہ جس پر شیطان کو وسوسہ اندازی کا موقع ملتا ہے کہ تم تو یہاں اپنا سب کچھ کھپا رہے ہو' پتا نہیں وہ آخرت ہوگی بھی کہ نہیں ہوگی! تم نے کسی پر اعتماد کر کے یہ فیصلہ کیا ہے لیکن پتا نہیں واقعہ کیا ہے! یہ ہے اصل میں شیطان کا ڈالا ہوا وسوسہ جس کو پس منظر میں رکھیں گے تب سمجھ میں آئے گا کہ اللہ کے اس وعدے کی حقانیت پر یہاں اتنا زور کیوں دیا جا رہا ہے اور اتنا تاکیدی انداز کیوں اختیار کیا گیا ہے: ﴿وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط﴾ ''یہ وعدہ اللہ کے ذمے ثابت ہے (شدنی' قطعی' یقینی اور حتمی وعدہ ہے) تورات میں' انجیل میں اور قرآن میں''۔ ''وَعْدًا عَلَيْهِ'' میں ''علیٰ'' کا صلہ جو آیا ہے اس میں انتہائی زور ہے کہ یہ وعدہ اس کے ذمے ہے اور یہ وعدہ اس پر ثابت ہے' یہ قطعی ہے' یہ حتمی ہے' یہ یقینی ہے۔ اور

اس کی تین مرتبہ توثیق ہو چکی ہے۔ اور تین کیا' اس کی توثیق تو ہزاروں بلکہ لاکھوں مرتبہ ہوئی۔ اگر وہ روایت درست ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء آئے ہیں' تو ہر نبی نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وعدے کی توثیق کی ہے۔ لیکن تین بڑے بڑے ادوار کے حوالے سے فرمایا کہ تورات میں یہ وعدہ ہوا' انجیل میں یہ وعدہ ہوا اور اب قرآن میں یہ وعدہ ہو رہا ہے۔

مزید فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ ﴾ ''اور اپنے عہد کا ایفاء کرنے والا اللہ سے بڑھ کر کون ہوگا؟'' اَوْفٰی کا لفظ جب آتا ہے تو اس کی دو شکلیں ممکن ہیں۔ فعل کی صورت میں اَوْفٰی' یُوْفِیْ' اِیْفَاءً باب اِفعال سے آتا ہے۔ لیکن یہاں یہ اَفْعَلُ کے وزن پر صیغۂ تفضیل ہے۔ یعنی سب سے بڑھ کر وفا کرنے والا' سب سے زیادہ پورا کرنے والا۔ کون ہوگا اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا؟ یہ دوسری تاکید ہوگئی۔ یہ بات مشاہدے اور تجربے سے ثابت ہے کہ ایک انسان کسی وقت جذبات میں کوئی بڑا فیصلہ کر بیٹھتا ہے۔ وقتی طور پر ایک تحریک پیدا ہوئی تو اپنا کیریئر تج دینے کا فیصلہ کر لیا اور کسی کے ساتھ جڑ گئے۔ لیکن محسوس ہو رہا ہے کہ طبیعت بجھی بجھی سی ہے' بجائے اس کے کہ طبیعت میں بشاشت ہو' وہ شخص اندر ہی اندر سے محسوس کر رہا ہے کہ یہ میں کتنا بڑا فیصلہ کر بیٹھا ہوں' معلوم نہیں میں نے صحیح کیا ہے یا غلط کیا ہے' مجھے اتنا بڑا اقدام اٹھانا بھی چاہیے تھا کہ نہیں! آناً فاناً کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اس طرح کی کسی کیفیت کا پیدا ہونا کوئی بعید نہیں ہے۔ لیکن اگر اس قسم کی کیفیت کا انسان کے اندر کوئی مستقل سایہ پڑ رہا ہو تو یہ ایک بہت خوفناک مرض کی علامت ہے۔ پھر اس ضمن میں اس کے اندر جو ایک کشمکش یا کشاکش ہوتی ہے وہ جماعتی زندگی کے اندر فتنہ انگیزی شروع کرتی ہے۔ ایسا شخص طرح طرح سے اپنے اس عدمِ اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ میں جذبات میں ایک غلط فیصلہ کر بیٹھا ہوں' لیکن اس کا علی الاعلان اعتراف آسان نہیں ہوتا۔ چنانچہ غیر شعوری طور پر اس کے اپنے اندر ایک بہت بڑی ہلچل ہوتی ہے' اور یہی ہلچل پھر جماعتی زندگی کے اندر طرح طرح کی خرابیوں کے پیدا ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب آیت کے ان الفاظ مبارکہ کا مطالعہ کیجیے: ﴿فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِیْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ﴾ ''تم خوشیاں مناؤ اپنی اس بیع پر جو تم نے کی ہے!'' یہ سودا کرنے کے بعد ملول کیوں ہو گئے؟ غمگین کیوں ہو گئے؟ تمہاری طبیعت میں انقباض کیوں آ گیا؟ کیا تمہیں اللہ کی بات پر یقین نہیں؟ تم کہیں بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تو نہیں ہو؟ یا تمہارا ''ویلیو سٹرکچر'' کا معاملہ ابھی واقعتاً پختہ نہیں ہوا تھا اور یہ بات تم نے شعوری طور پر طے نہیں کی تھی کہ ہم دنیا دے کر آخرت قبول کر رہے ہیں؟ سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا گیا: ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿١٦﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٧﴾﴾ ''مگر تم اس دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو' حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی ہے''۔ مطلوب یہ ہے کہ اس بات پر انسان کا دل مطمئن ہو جائے۔ اگر ایک وقت میں انسان اس کو قبول کر لے' اختیار کر لے یہ اور بات ہے اور اس پر دل کا جم جانا اور دل کا ٹھک جانا دوسری بات ہے۔

ہمارے منتخب نصاب میں سورۂ حٰمٓ السجدۃ کے درس کا آغاز ان الفاظِ مبارکہ سے ہوتا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ﴾ ''یقیناً جنہوں نے کہا ہمارا ربّ اللہ ہے' پھر اس پر جم گئے''۔ استقامت عملی درحقیقت استقامتِ قلبی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بالفعل جم جانا اسی وقت ممکن ہوگا جب کہ دل ٹھک چکا ہو۔ اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا: ((قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ))(١) ''کہو میں ایمان لایا اللہ پر' پھر اس پر جم جاؤ''۔

(١) مسند احمد ـ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب جامع اوصاف الاسلام۔

اگر ایمان میں ضعف ہوگا اور استقامتِ باطنی نہیں ہوگی تو اب انشراح کیسے ہوگا؟ ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی وعدہ کر بیٹھا ہو' لہٰذا لگا بندھا کچھ ساتھ چل بھی رہا ہو' اپنی عزتِ نفس کے تحفظ میں کچھ نہ کچھ بھاگ دوڑ بھی کر رہا ہو' کبھی کوئی بات مان بھی لیتا ہو' لیکن اندر کی کیفیت وہ نہ ہو جس میں بشاشت اور استبشار ہو۔ چنانچہ جس طرح سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿٣٠﴾﴾ ''اور بشارت حاصل کرو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے''۔ اسی طرح یہاں فرمایا گیا: ﴿فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِیْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ﴾ تم اپنے سودے پر خوشیاں مناؤ! تمہارے چہرے تو دمکنے چاہئیں۔ تمہیں تو اس پر جشن منانا چاہیے۔ تم نے وہ سودا کیا ہے کہ جس سے بڑا سودا کوئی نہیں۔ تم نے اپنے جسم و جان کی وہ قیمت وصول کی ہے جس سے بڑی قیمت کوئی نہیں۔ تم نے جنت کے عوض سودا کیا ہے' یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ تم نے اپنی جان اور مال کا جو سودا کیا ہے اس کی جتنی بڑی قیمت تمہیں ملی ہے اس پر تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔

﴿وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾﴾ ''اور (جان لو کہ) یہی ہے بڑی کامیابی!'' دنیا کا کوئی سودا ایسا نہیں ہے کہ جو اِس کے مقابلے میں آ سکے۔ دنیا و مافیہا اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ یہ ہے وہ بیع جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے کی گئی ہے۔ ''جہاد و قتال'' اقامت دین کی اس جدوجہد کا جامع عنوان ہے۔ اس میں جان لگتی ہے' مال کھپتا ہے' یہاں تک کہ جان کے جانے کا رسک لے کر آدمی کو میدان میں اترنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ سودا شعوری طور پر پہلے کر لیا گیا ہو اور اس پر دل ٹھک چکا ہو تو گاڑی ہمواری کے ساتھ رواں دواں رہے گی' لیکن اگر یہاں اس میں کوئی کمی ہے تو پھر قدم قدم پر رکاوٹ آئے گی۔ وہ رکاوٹ اندرونی اور داخلی ہوتی ہے جس کا ظہور خارج میں بھی ہو کر رہے گا۔

اللہ اور بندے کے درمیان ہونے والی اس بیع میں اللہ درحقیقت مشتری یعنی خریدنے والا ہے اور بندۂ مؤمن بائع یعنی بیچنے والا ہے۔ مبایعت ان کے مابین ہے' لیکن

عالمِ واقعہ میں اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے موجود نہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے غیب میں ہے یا یہ کہ ہم اس سے غیب میں ہیں۔ لہٰذا اب بالفعل یہ معاملہ اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی انسان دنیا میں اس کے نمائندے کی حیثیت سے یہ سودا کرتا ہے۔ جب تک نبوت و رسالت جاری رہی وہ نمائندہ نبی اور رسول ہوتا تھا۔ نبوت و رسالت کا سلسلہ بند ہونے کے بعد اب یہ نمائندہ وہ شخص ہوگا جو نبوی منہاج پر دین کی دعوت کے لیے کھڑا ہو' اقامت دین کے لیے کمر کس کے میدان میں آئے اور ندا لگائے: ﴿مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾۔ کون ہے میرا مددگار اللہ کے راستے میں؟ جو لوگ اس کی پکار پر لبیک کہیں ان کے اور اس داعی کے مابین اب یہ معاہدہ ہوگا اور بات پختہ کرنے کے لیے علامت کے طور پر مصافحہ بھی ہوگا۔ اس ''مصافحہ'' (بیعت) کا ذکر اب سورۃ الفتح میں ہو رہا ہے۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ کے مابین جو نسبت قائم ہوئی اس نے جو ظاہری صورت اختیار کی وہ بیعت کی شکل ہے جو صحابہ کرام ؓ نے محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے کی ہے۔ یہ بات میں نے بارہا کہی ہے کہ حضور ﷺ کے معاملے میں یا کسی نبی کے معاملے میں اس بیعت کی چنداں ضرورت نہیں ہے' اس لیے کہ نبی اور اُمتی یا رسول اور اُمتی کی نسبت اس سے اہم تر ہے۔ اُمتی ہر حال میں مطیع ہے۔ ہمارے ہاں تو اُمتی کا تصور بگڑ چکا ہے' لیکن کیا صحابہ کرام ؓ میں سے کسی کو اس میں اشتباہ ہو سکتا تھا کہ محمد ﷺ کو رسول مان لینے کا مطلب کیا ہے؟ یہی کہ آپؐ کو مطاع ماننا! یہ تو سابقہ انبیاء کرام کی دعوت بھی قرآن مجید میں ان الفاظ میں آئی ہے: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝﴾ (نوح) ''یہ کہ اللہ کی بندگی کرو' اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔ سورۃ الشعراء میں حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام' سب کی دعوت کے ضمن میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝﴾ ''میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں' لہٰذا اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔

اس اعتبار سے وہاں تو وہ اصل بنیادی نسبت زیادہ قوی اور مضبوط موجود ہے' لیکن میں اس بات پر پوری طرح انشراحِ صدر رکھتا ہوں کہ بیعت کا معاملہ حضور ﷺ نے اُمت کی رہنمائی کے لیے کیا ہے۔ آپؐ کو بیعت لینے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ لیکن آپؐ کے بعد آئندہ تو نبی اور اُمتی کی یہ نسبت کبھی قائم نہیں ہوگی۔ وہ تو ہمیشہ ہمیش کے لیے' تا قیامِ قیامت قائم ہو چکی محمدٌ رسول اللہ ﷺ اور ہر کلمہ گو کے مابین۔ لیکن جب بھی کوئی عملی جدوجہد ہوگی' کوئی اجتماعیت تشکیل پائے گی' کوئی تعیین ہوگی کہ کون لوگ اعوان و انصار ہیں اور معین ہوگا کہ ان کی کتنی قوت ہے' تو اس کے لیے کوئی نہ کوئی علامت اور اس کا کوئی نظام ہونا لازم ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ نسبتِ بیعت کہ جو اَب اُمت کے اندر چلی ہے۔ اُمت کی پوری تاریخ میں آپ کو نظر آئے گا کہ جو بھی اجتماعی ہیئت وجود میں آئی وہاں بیعت کا نظام اختیار کیا گیا۔ اجتماعیت کی بلند ترین اور نمایاں ترین صورت حکومت کا قیام ہے' وہ بھی بیعت کی بنیاد پر قائم ہوتی رہی۔ اس کی خفی ترین صورت سلسلۂ ارشاد و اصلاح ہے' اس کے لیے بھی بیعت کا نظام رائج ہے۔ کبھی حکومت کے خلاف بغاوت کی تحریک اٹھی تو وہ بھی بیعت کی بنیاد پر اٹھی۔ چنانچہ اجتماعیت درحقیقت جس شے کا نام ہے وہ اسلام میں بیعت ہی کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔

سورۃ الفتح میں بیعتِ رضوان کا ذکر

وہ بیعت جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کرام ؓ نے حدیبیہ کے مقام پر کی' اس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۸ میں صراحت کے ساتھ آیا ہے: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ ''اللہ تعالیٰ راضی ہو چکا اہل ایمان سے جبکہ (اے نبیؐ) وہ آپ سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے''۔ فعل ماضی پر جب 'قَدْ' آتا ہے تو اس کے قطعی' حتمی اور یقینی ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ ﴿فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ ''تو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا جو کچھ کہ ان کے دلوں میں تھا''۔ اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں کی کیفیت کو خوب جانتا تھا۔ ﴿فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ﴾ ''اس لیے اس نے اُن پر سکینت نازل فرمائی''۔ یعنی قلبی اطمینان عطا فرما دیا۔ حالانکہ معلوم تھا کہ ہم نہتے ہیں' ہم احرام باندھے ہوئے ہیں' ہم پر اچانک ہجوم ہو جائے' ایک دم حملہ ہو جائے تو کیا ہوگا؟ لیکن نہیں! انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اطمینان اور سکون کی کیفیت نصیب ہوگئی۔ اس لیے کہ وہ تو جان دینے کا سودا پہلے سے کیے ہوئے ہیں' بالکل مطمئن ہیں' دل ٹھکا ہوا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ اس سے بڑا سودا کوئی نہیں۔ وہ تو جان دیتے وقت ''فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ'' پکارنے والے لوگ تھے کہ ربّ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا! ان کا معاملہ اس طرح کا ڈانواں ڈول معاملہ نہیں تھا۔ اس کی طرف اشارہ ہو رہا ہے: ﴿فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝۱۸﴾ ''تو اللہ نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو بدلے میں قریبی فتح عطا فرمائی''۔ سورۃ الفتح کے تفصیلی درس میں مَیں یہ بیان کر چکا ہوں کہ اس فتح سے مراد صلح حدیبیہ کی فتح بھی ہے اور فتح خیبر بھی ہے جو اس کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے بطورِ انعام عطا فرمائی اور جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بہت سا مالِ غنیمت فراہم فرمایا۔

اہل ایمان کی بیع وشراء کس کے ہاتھ پر؟

سورۃ الفتح کی آیت ۱۰ میں وہ اصل حقیقت بیان ہو رہی ہے کہ بات سمجھ لو کہ اصل میں یہ بیع و شراء کس کے ہاتھ پر ہے' کس کے مابین ہو رہی ہے' اس مبایعت کے فریق

کون ہیں! فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ﴾ ''یقیناً (اے نبیؐ!) جولوگ آپ سے بیعت کررہے ہیں حقیقت میں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں''۔ سودا اللہ سے ہوا ہے۔ تبایع یا مبایعت بندۂ مؤمن اور اللہ کے مابین ہے۔ نبی اس وقت عالمِ واقعہ میں اللہ کی طرف سے وصول کنندہ (receiver) ہے۔ یہ جو نظم قائم ہوا ہے اس میں اب ان کی حیثیت امیر کی اور ان کے ساتھیوں کی حیثیت مأمورین کی ہے۔ یہ سودا کرنے والے اپنے جان اور مال اب ان کے حکم سے صرف کریں گے' ان کے مطالبے پر حاضر کردیں گے' جیسے اور جب وہ چاہیں گے یہ پیش کردیں گے۔ لیکن یہ کہ اصل سودا اللہ کا اور بندے کا ہے۔ ﴿یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ﴾ ''اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھوں کے اوپر''۔ اب یہاں وہ بیعت کا پورا نقشہ کھینچ دیا گیا' کیونکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت ہوتی ہے۔ بیعت کرنے والے کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے اور بیعت لینے والا کا نیچے ہوتا ہے۔ لیکن یہاں فرمایا کہ ایک اور تیسرا ہاتھ بھی ہے۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر ایک اور ہاتھ ہے اور وہ اللہ کا ہاتھ ہے۔ تو یہ ایک سہ فریقی (tripartite) معاہدہ ہے۔ عالم واقعہ میں یہ بیعت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر ہورہی ہے اور حقیقتاً یہ بیعت اللہ سے ہورہی ہے۔ ﴿یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ﴾ ''اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے''۔

﴿فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ ۚ﴾ ''اب جو اِس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اسی پر ہوگا''۔ اس بیعت کا یہ رُخ جو ہے بہت اہم ہے۔ نوٹ کیجیے عربی زبان میں حروف کے اعتبار سے جو الفاظ مماثل اور مشابہ ہوتے ہیں ان کے معانی میں اور ان کی حقیقت میں بھی ایک بہت گہرا ربط ہوتا ہے اور ان میں ثقالت اور لطافت کی بھی ایک نسبت ہوتی ہے۔ نقض کے معنی ہیں توڑ دینا' ختم کر دینا۔ یہود کے بارے میں فرمایا: ﴿فَبِمَا نَقۡضِہِمۡ مِّیۡثَاقَہُمۡ﴾ (المائدۃ:۱۳) 'اس وجہ سے کہ یہ اپنے عہد معاہدے کو توڑ دیتے ہیں''۔ نقضِ عہد' نقضِ میثاق کی ترکیب ہم استعمال کرتے ہیں۔ ایک اصطلاح ''نقضِ غزل'' بھی ہے جو اِس آیتِ قرآنی سے ماخوذ ہے: ﴿وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّتِیۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَہَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّۃٍ اَنۡکَاثًا ؕ﴾ (النحل:۹۲) ''اور اس بڑھیا کی مانند نہ بن جاؤ جس نے اپنے محنت سے کاتے ہوئے سوت کو توڑ دیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے''۔ لفظ ''نَکَثَ'' بھی دراصل ''نَقَضَ'' کے مشابہ ہے۔ ''ن'' دونوں میں مشترک ہے' نَکَثَ میں ''ق'' کے بجائے ''ک'' ہے' اسی طرح ''ض'' ثقیل حرف ہے تو اس کی جگہ ''ث'' ہے جو خفیف ہے۔ ''نَکَثَ'' کے معنی بھی توڑ دینا ہیں' لیکن یہ خفیف ہے۔ یعنی ایک اعلانیہ بات نہیں ہے' بلکہ انسان اندر ہی اندر ٹوٹ رہا ہے' قول وقرار سے پھر رہا ہے' اندر ہی اندر پسپائی ہورہی ہے۔

یہی بات مَیں نے ارتداد کے ضمن میں عرض کی تھی کہ ایک ارتداد ظاہری ہے' کھلم کھلا ہے' اس کے اوپر تو مفتی کا فتویٰ لگے گا' قاضی کا حکم لگے گا اور حد جاری ہو جائے گی' لیکن ایک وہ ارتداد ہے جو اندر ہی اندر ہو رہا ہے' ایک اندرونی پسپائی (retreat) ہے' آدمی اپنے نقشِ قدم سے لوٹ رہا ہے۔ یہ جو اندر ہی اندر والا ارتداد ہے یہ نفاق ہے' جس پر قاضی کا حکم نہیں لگ سکتا' مفتی کا فتویٰ نہیں چل سکتا۔ نفاق پر تو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے کسی حکم کا کوئی اجراء نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ تو ایک باطنی حقیقت ہے۔ یہی معاملہ یہاں نکث کا ہے۔ ﴿فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ ۚ﴾ اب جو اِس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا۔ لہٰذا اپنے آپ کو ٹٹولتے رہا کرو' دیکھتے رہا کرو۔ جیسے ہم اپنے محاورے میں کہتے ہیں کہ اپنے گریبانوں میں جھانکتے رہا کرو۔ اپنے دلوں کا جائزہ لیتے رہو کہ اس پر انشراح ہے' انبساط ہے' استبشار ہے یا انقباض ہو چکا ہے؟ کہیں پسپائی تو نہیں کر چکے؟ اندر ہی اندر کہیں اس قول وقرار کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی؟ جان لو کہ جو کوئی بھی یہ شکل اختیار کرے گا وہ اس کا سارا وبال درحقیقت اپنے اوپر لے گا۔ اس لیے کہ جس کے ہاتھ پر بیعت کی جا رہی ہے اس نے تو آپ سے کوئی چیز طے ہی نہیں کی۔ سودا تو آپ کا اللہ کے ساتھ ہوا تھا' قیمت اُسی نے دینی ہے' محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے تمہیں کوئی قیمت نہیں دینی' قیمت تو تم اللہ سے لو گے۔ تمہارا عہد' قول وقرار اور مبایعت تو اللہ سے ہوئی ہے۔ تم اگر اپنے عہد سے پھرے تو سارا وبال اپنے اوپر لو گے' ان کا کوئی نقصان نہیں ہوگا' انہیں کسی طرح کا کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ اس معاملے میں ذمہ داری ساری تمہاری ہے۔

اب آگے وہی لفظ ''اَوۡفٰی'' فعل کی صورت میں آ گیا ہے (اَوۡفٰی' یُوۡفِیۡ' اِیۡفَاءً)۔ سورۃ التوبۃ کی مذکورہ بالا آیت میں ''اَوۡفٰی'' افعل التفضیل کا صیغہ تھا' یعنی سب سے بڑھ کر وفا کرنے والا۔ یہاں یہ فعل ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ فرمایا: ﴿وَمَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰہَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۱۰﴾﴾ ''اور جس نے اس عہد کو پورا کیا جو اُس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ تعالیٰ عنقریب اسے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا''۔ یہ ہے بیعت کی اصل حقیقت کہ جس سے ایک اجتماعیت وجود میں آتی ہے اور اس میں امیر اور مأمور کی نسبت قائم ہوتی ہے۔

سورۃ الممتحنہ میں ''بیعت النساء'' کا تذکرہ

بیعت کا لفظ قرآن مجید میں چوتھی بار سورۃ الممتحنہ میں آیا ہے جہاں خواتین کی بیعت کا ذکر ہے۔ سورۃ الممتحنہ' سورۃ الفتح کے بعد نازل ہوئی ہے' جس میں صلح حدیبیہ کا ذکر ہے۔ صلح حدیبیہ میں طے ہو گیا تھا کہ اگر کوئی مسلمان مکّہ سے مدینہ آ جائے گا تو اسے واپس کرنا ہوگا۔ اسی ضمن میں اب خواتین کا مسئلہ پیدا ہوا جو ایک جداگانہ حیثیت کا معاملہ تھا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر یہ سورۃ الممتحنہ نازل ہوئی۔ بہرحال میں اس پوری بحث میں نہیں جا رہا' صرف یہ آیت نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید میں بیعت کا ذکر چوتھی بار اِس آیت

میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ﴾ ''اے نبیؐ! جب آپ کے پاس مؤمن خواتین بیعت کرنے کے لیے آئیں'' ﴿عَلٰۤی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا﴾ ''اس بات پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کریں گی'' ﴿وَّلَا یَسْرِقْنَ﴾ ''اور چوری نہیں کریں گی'' ﴿وَلَا یَزْنِیْنَ﴾ ''اور بدکاری نہیں کریں گی'' ﴿وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ ''اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی'' ﴿وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ﴾ ''اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے کوئی بہتان گھڑ کر نہیں لائیں گی'' ﴿وَلَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ﴾ ''اور کسی معروف کام میں جو حکم آپ دیں گے اس سے سرتابی نہیں کریں گی'' ﴿فَبَایِعْهُنَّ﴾ ''تو (اے نبیؐ!) ان کو بیعت کر لیجیے!'' ان کی بیعت قبول فرمائیے۔ ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے مغفرت طلب کیجیے'' ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ غفور ہے' رحیم ہے''۔

یہ قرآن حکیم کے چار مقامات ہو گئے جن میں بیعت کا لفظ آیا ہے۔ ان میں سے سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ بیعت کی اصل حقیقت کو واضح کر رہی ہے' اور تین آیات میں لفظ بیعت کا ایک اصطلاح کے طور پر ذکر ہے۔

سیرت النبی ﷺ سے بیعت کا ثبوت

بیعت کے ضمن میں ہمیں سیرت النبی ﷺ سے جو طرزِ عمل ملتا ہے وہ ایک بالکل فطری معاملہ ہے۔ مکی دَور میں اہل مکّہ میں سے جو لوگ اسلام لائے سیرت میں ہمیں ان سے کسی بیعت کا ذکر نہیں ملتا (میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ان سے حضور ﷺ نے بیعت نہیں لی' لیکن ذکر نہیں ملتا)۔ سیرت النبیؐ میں حضراتِ ابوبکر' عمر اور حمزہ رضی اللہ عنہم کے ایمان لانے کے واقعات بڑے اہم ہیں اور ان کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے' لیکن ان کی تفصیلات میں کہیں بھی بیعت کا لفظ نہیں آتا۔ البتہ اگر کوئی شخص باہر سے آیا اور اس نے آ کر اسلام کا اظہار کیا' وہ اسلام لایا تو اس کے ضمن میں روایات مل جاتی ہیں کہ پھر وہ مصافحہ اور قول و قرار بھی ہوا' اور اسے بیعتِ اسلام کہتے ہیں۔ یہ بیعتِ اسلام مکی دَور میں ثابت ہے' لیکن اہل مکّہ سے نہیں' باہر سے آنے والوں سے۔ اس کے بعد ایک بیعتِ نظمِ جماعت' ڈسپلن اور سمع و طاعت کی بھی سیرتِ طیبہ سے ثابت ہے' لیکن اس کا بھی ہمیں مکّہ والوں سے پورے مکی دَور میں کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ میں پھر عرض کروں گا کہ کسی شے کا عدم ثبوت اس کے عدم وجود کو مستلزم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی واقعہ ہوا ہو لیکن مذکور نہ ہو۔ بہرحال واقعہ یہی ہے کہ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن مدینہ والوں سے دو اہم بیعتیں محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے لی ہیں۔ ایک سن ۱۱ نبوی میں اور دوسری سن ۱۲ نبوی میں۔

اہل مدینہ میں سے سب سے پہلے چھ افراد ایمان لائے تھے' ان کے ضمن میں کسی بیعت کا ذکر نہیں۔ یہ اغلباً سن ۱۰ نبوی ہی کا واقعہ ہے' وہی سال کہ جس میں آپؐ نے طائف کا سفر کیا تھا۔ وہاں سے آپؐ واپس آئے تو اس کے فوراً بعد جو موسمِ حج آیا اس میں مدینہ کے چھ افراد حضور ﷺ پر ایمان لائے۔ لیکن اس وقت بھی کسی بیعت کا ذکر نہیں ہے۔ اگلے سال وہ بارہ تھے۔ پہلے سال والے چھ میں سے ایک صاحب نہیں آئے تھے' ان میں سے پانچ تھے اور سات مزید تھے۔ جب بارہ افراد نے اسلام کا اظہار کیا تو پہلی بیعت ہوئی۔ اس کو بیعت عقبہ اُولیٰ کہتے ہیں۔ اس بیعت کے الفاظ تقریباً وہی تھے جو کم و بیش دس برس بعد بیعت النساء کے ضمن میں نازل ہوئے اور ابھی ہم نے سورۃ الممتحنۃ کی آیت میں پڑھے ہیں۔ گویا اس بیعت میں کسی نظمِ جماعت کا ایک بیج تو موجود ہے' حکم ماننے کا اقرار ہو رہا ہے کہ جو بھی نیکی کی بات آپؐ فرمائیں گے ہم مانیں گے' لیکن اس میں نظمِ جماعت' سمع و طاعت اور اس کے مختلف لوازم کو ظاہر نہیں کیا گیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جیسے گٹھلی کے اندر پورا درخت اور بیج کے اندر پورا پودا موجود ہوتا ہے اسی طرح یہ لوازم اسی بیعت میں بالقوۃ (potentially) موجود ہیں۔ بعد میں اُمت میں جو بیعت ارشاد کا سلسلہ چلا اس کے لیے اس بیعت کو بطور سند اور بطور دلیل قبول کیا گیا کہ اس میں شرک سے اجتناب' چوری سے اجتناب' بدکاری سے اجتناب' قتلِ اولاد سے اجتناب اور بہتان طرازی سے اجتناب وغیرہ کا وعدہ ہے۔ چنانچہ اس کو بیعتِ توبہ بھی کہا جاتا ہے' بیعتِ ارشاد بھی اور بیعتِ اصلاح بھی۔

تو یہ جو خواتین کی بیعت قرآن میں مذکور ہے یہی بیعت ہمیں بیعت عقبہ اُولیٰ کی صورت میں سیرت النبیؐ میں ملتی ہے اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مذکور ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ بیعت عقبۂ اُولیٰ اور بیعت عقبۂ ثانیہ دونوں بیعتوں میں موجود تھے۔ ابھی ہم جو بات سمجھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ بیعت درحقیقت کسی نظم کا ہیولیٰ اپنے اندر کم سے کم ظاہری اور نمایاں طور پر نہیں رکھتی' بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ایمان بالرسالت کے اندر اس کے پورے مضمرات موجود ہیں کہ جب آپؐ کو رسول مان لیا' ایمان لے آئے تو اطاعت تو کرنی ہے' اسی طرح اس کا صرف ایک تھوڑا سا اظہار کر دیا گیا کہ آپؐ ہمیں جو حکم بھی دیں گے اس کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ اس بیعت کے وقت اہل مدینہ نے کہا تھا کہ ہمیں اپنا کوئی جان نثار' اپنا ساتھی دیجیے جو ہمیں قرآن پڑھائے۔ حضور ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ کر دیا اور بعد میں کچھ دنوں کے بعد حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی بھیجا۔ ان حضرات کی تعلیم اور تبلیغ سے اب وہاں پر جو انقلاب آیا تو اگلے سال ۷۲ مرد اور ۳ عورتیں آئیں اور ان ۷۵ افراد نے جو بیعت کی وہ ہے بیعتِ عقبہ ثانیہ' اور وہ سرتاسر نظمِ جماعت کی بیعت ہے۔

اس کی وجہ بھی سمجھ لیجیے کہ حضور ﷺ نے یہ بیعتِ جماعت مکّہ والوں سے کیوں نہیں لی؟ اس کا ایک سبب بالکل ظاہر و باہر ہے کہ حضور ﷺ وہاں خود موجود ہیں' ابھی کوئی

نظم علیحدہ سے قائم کرنے کی ضرورت نہیں‘ کسی اور کو امیر بنانے کا سوال نہیں۔ وہ chain ابھی وجود میں نہیں آ رہی کہ ایک کے بعد دوسرا اور اس کے بعد تیسرا امیر مقرر کیا جائے۔ حضورﷺ خود موجود ہیں۔ لہٰذا جو چیز از خود ہو رہی ہو اس کے لیے خواہ مخواہ کے تکلف اور تصنع کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ جیسے مکّہ والوں سے بیعتِ اسلام ثابت نہیں‘ اسی طرح اُن سے کوئی بیعت سمع وطاعت بھی ثابت نہیں۔ اور جس طرح باہر سے آنے والے اسلام لائے تو ان کے لیے بیعت کا ذکر مل گیا اسی طرح مدینہ والے آئے تو اُن سے بیعت سمع وطاعت لی گئی۔ اور یہ بیعت سمع وطاعت بھی شروع میں نہیں لی گئی‘ بلکہ جب وہاں ایک ہیئت اجتماعیہ کے قیام کی ضرورت پیش آ گئی کہ اب دو چار آدمیوں کی بات نہیں ہے‘ ۷۲ افراد ہیں‘ تو ان سے بیعت سمع وطاعت لی گئی اور ان کے اندر حضورﷺ نے بارہ نقیب مقرر فرمائے۔ یہ نقیب کون تھے؟ یہ حضورﷺ کے نامزد کردہ تھے اور وہاں پر حضورﷺ کی طرف سے ڈسپلن اور نظم کے ذمہ دار مقرر کیے گئے تھے۔ ان کے پاس ذاتی حیثیت سے کوئی اتھارٹی یا اختیار نہیں تھا۔ جیسے دوسرے ایمان لانے والے ہیں ویسے یہ ایمان لانے والے ہیں۔ ان کو اگر کوئی فوقیت یا فضیلت حاصل ہوئی تو وہ درحقیقت نبی اکرمﷺ کی نامزدگی سے حاصل ہوئی۔ اب یہاں ضرورت پیش آئی کہ وہ پورا ڈھانچہ اور پورا انظام تشکیل پا جائے‘ کہ کوئی شخص کوئی اتھارٹی حاصل کر رہا ہے تو کس بنیاد پر؟ اس لیے کہ حضورﷺ نے اس کو نامزد کیا ہے۔ اب گویا کہ ایک نظم قائم ہو رہا ہے۔ حضورﷺ تو ابھی مکّہ میں تشریف فرما ہیں۔ مدینہ والوں سے ملاقات بھی ہوگی تو ایک سال کے بعد موسمِ حج میں ہوگی۔ یہاں مدینہ میں جو کام چلے گا اس کا کون نگران ہے‘ کون ذمہ دار ہے؟ کون امیر ہوگا‘ کون مأمور ہوگا؟ کون حکم دے گا‘ کون سنے گا؟ کس پر اطاعت لازم ہوگی؟ یہ ہے اصل میں وہ وقت کہ جب مدینہ والوں سے آپؐ نے بیعت سمع وطاعت لے لی۔ فلسفۂ سیرت کو سمجھنے کے لیے اس تاریخی پس منظر کو اور اس تدریج کو سمجھنا ضروری ہے کہ کس طرح سے حالات کی exfoliation ہوئی ہے‘ کس طرح سے تقاضے ابھرے ہیں‘ کہاں ضرورت پیدا ہوئی ہے۔ جہاں کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں ہمیں سیرت النبیؐ میں کوئی تکلف اور کوئی تصنع نظر نہیں آتا۔

بیعت عقبہ ثانیہ — نظم جماعت کی بیعت

حضرت عبادہ بن صامت ؓ کی روایت کے حوالے سے میں نے بیعت کے جو الفاظ شروع میں سنائے یہ روایت متفق علیہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے اس سے اونچا درجہ کسی حدیث کا نہیں جو متفق علیہ ہو‘ جس کی صحت پر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں کا اتفاق ہو۔ اب ہم اس حدیث کا لفظاً لفظاً مطالعہ کرتے ہیں۔ عَنْ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ’’حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کی گئی ہے‘ اللہ اُن سے راضی ہو‘‘۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ دونوں بیعتوں میں موجود تھے‘ بیعتِ عقبۂ اُولی کی روایت بھی ان سے ہے اور بیعت عقبۂ ثانیہ کی روایت بھی ان سے ہے۔ کہتے ہیں: بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ’’ہم نے بیعت کی تھی رسول اللہﷺ سے‘‘۔ کس بات پر بیعت کی تھی؟ کیا قول وقرار ہوا تھا؟ کیا معاہدہ ہوا تھا؟ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ’’سمع وطاعت پر‘‘۔ یعنی سنیں گے اور مانیں گے۔ جو حکم ہوگا بسر وچشم تسلیم کریں گے۔ نوٹ کر لیجیے کہ یہاں معروف کا لفظ نہیں ہے‘ اس لیے کہ یہ نظم جماعت کی بیعت ہے جو محمدٌ رسول اللہﷺ کے ہاتھ پر ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہاں اس اضافی لفظ کو لانے سے جو تھوڑا سا معاملہ نرم پڑ تا تھا اس سے گریز کیا گیا۔ مدینہ آ کر یہ بیعت حضورﷺ نے پھر سب سے لی ہے‘ مہاجرین سے بھی لی ہے۔ ہجرت کے بعد تو پھر ایک نظم قائم ہو رہا تھا۔ چنانچہ بیعت لیتے ہوئے آنحضورﷺ بعض اوقات ’’فِي الْمَعْرُوْفِ‘‘ یا ’’فِيْ مَا اسْتَطَعْتُمْ‘‘ کے الفاظ کا اضافہ فرما دیا کرتے تھے کہ اپنی حدّ استطاعت تک‘ اپنی امکانی حد تک اس بیعت پر قائم رہو گے۔ لیکن یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ اس معاملے میں ’’اُمّ السُّــنَّة‘‘ کا درجہ درحقیقت اسی حدیث کو حاصل ہے اور اس میں وہ الفاظ موجود نہیں ہیں‘ تا کہ بات پوری ہو‘ پختہ ہو‘ گاڑھی ہو۔ حضورﷺ کے معاملے میں معروف کی کوئی اضافی شرط لگانے کی عقلاً یا نقلاً ضرورت ہی نہیں۔ البتہ آئندہ ہمیشہ یہ شرط موجود رہے گی۔ وہ چاہے بیعتِ حکومت ہو یا بیعت نظم جماعت۔ ’’فِي الْمَعْرُوْفِ‘‘ کی یہ شرط تو حضرت ابوبکر ؓ اور حضرت عمر ؓ کی بیعت کے ساتھ بھی موجود تھی‘ تا بہ دیگراں چہ رسد! ان سے زیادہ کس کو حق ہوگا سمع وطاعت کا؟ لیکن وہاں بھی معروف کی شرط برقرار تھی۔ اس لیے کہ اب کوئی شخص اپنی ذات میں معیار نہیں ہے‘ اب معیارِ مطلق اللہ اور اس کا رسولؐ ہے۔

اب آگے جو الفاظ آ رہے ہیں ان پر غور کیجیے۔ چونکہ ڈسپلن قائم کرنا ہے لہٰذا ایسے الفاظ لائے گئے ہیں جو ایک حصار قائم کر رہے ہیں اور بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑ رہے۔ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ ’’ہم سمع وطاعت پر کاربند رہیں گے چاہے مشکل ہو چاہے آسانی ہو‘‘۔ شعوری طور پر زبان سے ایک شخص جب یہ الفاظ کہتا ہے‘ اور اگر واقعتاً وہ بودا انسان نہیں ہے اور سیرت وکردار کے اعتبار سے اسے دیمک نے چٹ نہیں کیا ہوا تو وہ یہ جب کہے گا خوب سوچ سمجھ کر کہے گا کہ میں حکم سنوں گا اور مانوں گا‘ چاہے تنگی ہو‘ چاہے آسانی ہو۔ عُسر کا لفظ ویسے تو ہر مشکل کے لیے عام ہے لیکن اس کا اطلاق خاص طور پر مالی تنگی پر ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں مالی تنگی کا ذکر زیادہ آیا ہے۔ تو اس بات پر بیعت ہو رہی ہے کہ چاہے ہمارے لیے آسانیاں ہوں‘ فراوانیاں ہوں یا تنگیاں ہوں‘ ہر حالت میں ہم آپؐ کا حکم سنیں گے اور مانیں گے۔

وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ ’’طبیعت کی آمادگی میں بھی اور ناگواری میں بھی‘‘۔ منشط‘ نشاط سے بنا ہے۔ نشاطِ طبیعت کے اندر ایک آمادگی کی کیفیت ہے۔ انسان جب کسی چیز

سے متفق ہوتا ہے تو اس کے لیے کام کرنے کے لیے طبیعت میں آمادگی ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کہ کبھی کسی اجتماعی معاملے میں بہت بحث اور ردّ وقدح ہوئی ہے اور آراء کا اختلاف سامنے آیا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ آخری فیصلہ تو ایک ہوگا' اور وہ کچھ لوگوں کی رائے کے مطابق ہوگا اور کچھ کی رائے کے خلاف ہوگا۔ اب جن کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا ہے انہیں تو آپ دیکھیں گے کہ بڑے چاق و چوبند ہو کر اس میں لگ رہے ہیں' اس لیے کہ وہ تو اُن کی طبیعت کا انشراح ہے' ان کی اپنی رائے یہی تھی' ان کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا ہے' جبکہ جن لوگوں کی رائے کے خلاف فیصلہ ہوا ہے انہیں اب اپنی طبیعت کو اس کے لیے مجبور کرنا پڑے گا۔ تو ''فِی الْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ'' کے الفاظ نے ان دونوں کیفیتوں کا گھیراؤ کر لیا ہے۔ چاہے طبیعت آمادہ ہو اور چاہے طبیعت پر جبر کرنا پڑے' اکراہ کرنا پڑے' اسے مجبور کرنا پڑے۔ اس لیے کہ نظم اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ جماعتی زندگی کی تو روحِ رواں یہی ہے۔ یہی اس کا لازمی تقاضا ہے۔

اگر آدمی طے کر لے کہ فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق ہوگا تو ہم ساتھ دیں گے' ورنہ جن کی رائے کے مطابق ہوا وہ آگے بڑھیں' تو یہ جماعتی اعتبار سے منافقت ہے' جس کی سب سے نمایاں مثال غزوۂ اُحد میں سامنے آئی جب عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو آدمیوں کے ساتھ یہ کہہ کر واپس لوٹ گیا کہ جب ہمارے مشورے پر عمل نہیں ہوتا تو ہم خواہ مخواہ اپنی جانیں خطرے میں کیوں ڈالیں؟ اس کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر محصور ہو کر دفاع کیا جائے۔ عجیب بات ہے کہ خود حضور ﷺ کی رائے بھی اگرچہ یہی تھی' لیکن حضور ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی رائے کا احترام کیا اور ان کی دل جوئی کے لیے' ان کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے' اپنی رائے پر ان کی رائے کو مقدم رکھ کر فیصلہ کر دیا۔ حضور ﷺ جب مدینہ منورہ سے نکلے تو آپؐ کے ہمراہ ایک ہزار کی نفری تھی' لیکن اس شخص نے عین میدانِ جنگ میں کتنا بڑا نقصان پہنچایا' جس سے اس وقت کتنے ہی مؤمنین صادقین کے پاؤں میں بھی ایک دفعہ تو تزلزل پیدا ہوا ہوگا کہ ایک تہائی نفری ٹوٹ کر جا رہی ہے! پہلے ہی ہم مقابلے میں ایک تہائی تھے' تین ہزار کا ایک ہزار سے مقابلہ تھا' اب ہماری ایک تہائی نفری ٹوٹ کر جا رہی ہے۔ اسی لیے سورۂ آلِ عمران میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا﴾ (آیت ۱۲۲) ''(وہ وقت یاد کرو) جب تم میں سے بھی دو گروہ ایسے تھے کہ جو ڈھیلے پڑ گئے تھے''۔ جن کے پاؤں میں تزلزل آ گیا تھا۔ عبداللہ بن اُبی کا یہ اقدام کس بنیاد پر تھا؟ ان لوگوں کا کہنا تھا: ﴿ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ﴾ (آیت ۱۵۴) ''ہمارے ہاتھ میں بھی کوئی اختیار ہے کہ نہیں؟'' اپنی من مانی کرتے ہیں' جو چاہتے ہیں فیصلہ کر دیتے ہیں' یہ معاملہ تو نہیں چل سکتا' اگر اس طرح معاملہ چلانا ہے تو پھر خود ہی جائیں' خود ہی اپنی جان و مال پر سارے خطرات برداشت کریں' ہم ساتھ نہیں دیں گے!! یہ ہے وہ چیز جس کا سدّ باب کیا گیا ان الفاظ میں کہ فِی الْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ چاہے ہماری طبیعت میں نشاط ہو' آمادگی ہو اور چاہے ہمیں اپنی طبیعت پر جبر کرنا پڑے۔ اگر ہم اسے خوشگوار فیصلہ محسوس کریں تب بھی حکم مانیں گے اور اگر ہماری طبیعت کے خلاف ہو' ہم اس کے لیے اپنی طبیعتوں کو آمادہ نہ پا رہے ہوں تب بھی ہم اپنی طبیعتوں کو مجبور کریں گے اور آپ کا حکم مانیں گے۔

آگے چلیے! وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا ''اور اس پر بھی (ہم نے بیعت کی) کہ چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے''۔ یہ جماعتی زندگی کا تیسرا معاملہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ہی امیر تو نہیں ہے' جماعتی زندگی میں تو ایک chain چلے گی۔ ایک امیر ہے' اس نے کسی کو اپنا ایک نائب مقرر کیا ہے' پھر وہ کوئی لشکر بھیج رہا ہے تو وہاں اس نے کسی کو سپہ سالار بنایا ہے۔ اس لشکر میں سپہ سالار ہی تو نہیں ہے' کوئی میمنہ کا اور کوئی میسرہ کا امیر ہے' کوئی قلب کا انچارج ہے۔ میمنہ اور میسرہ کے اندر بھی کئی گروپ ہیں' کسی کے پاس کسی گروپ کا جھنڈا ہے' کسی کے پاس کسی کا ہے۔ تو جب بھی کوئی ہیئت اجتماعی قائم ہوگی تو اس میں یہ chain ناگزیر ہے۔ سوائے ایک شخص کے جو اُس ہیئت اجتماعی کا امیر ہے' وہ تو امیر ہی ہے' باقی تو ہر شخص امیر بھی ہے اور مأمور بھی ہے۔ اپنے سے اوپر والے کا مأمور ہے اور اپنے سے نیچے والوں کے لیے امیر ہے۔

اس ضمن میں ایک اعتراض یہ اٹھا دیا جاتا ہے کہ صاحبِ امارت کے انتخاب اور عزل و نصب کے کوئی قواعد و قانون ہونے چاہئیں' یہ کیا بات ہوئی کہ جس کو چاہا پسند کر لیا اور اس کو جھنڈا تھما دیا۔ اس اعتبار سے آخری امتحان جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام ؓ کا لیا ہے وہ حضرت اسامہ ؓ کی امارت کا امتحان ہے۔ کس اعتبار سے وہ افضل تھے؟ عمر میں وہ پختہ نہیں تھے۔ ابوبکر و عمر' عثمان و علی اور دیگر کبار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم موجود ہیں اور جھنڈا تھما دیا اسامہ بن زیدؓ کو۔ یہ ایک بہت بڑا امتحان تھا۔ جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ چاہے تم پر ایک حبشی غلام امیر بنا دیا جائے' تمہیں اس کا حکم ماننا ہوگا۔ یہ نہیں کہ ہم اعلیٰ ہیں' ہم برتر ہیں اور یہ کمتر ہے' اس کو ہم پر خواہ مخواہ امیر بنا دیا گیا' کوئی معیار ہونا چاہیے' کوئی قاعدہ' قانون اور ضابطہ ہونا چاہیے' یہ کیا ہے کہ بس ایک شخص پسند آ گیا اور اس کو امیر بنا دیا!! ان ساری چیزوں کا سدّ باب پہلے ہی سے کر دیا گیا اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات تسلیم کروالی کہ یہ میرا اختیار ہوگا' جس کو چاہوں امیر بناؤں۔ بیعت میں ''وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا'' کے الفاظ ادا کرنے والے پہلے سے طے کر رہے ہیں' عہد کر رہے ہیں کہ چاہے دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے پھر بھی ہم سمع و طاعت پر کاربند رہیں گے۔ دیکھئے یہاں اس کا بھی امکان ہے کہ آپ یہ سمجھیں کہ واقعتاً یہی شخص جس کو امیر بنایا جا رہا ہے' افضل ہے یا اہل تر ہے' لیکن ایک خیال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ہم میں افضل نہیں ہے۔ اس کے باوجود جس کے ہاتھ میں جھنڈا تھما دیا جائے' تمہیں اس کی اطاعت کرنی ہے۔ یہ chain جو ہے اطاعت کی' اسے برقرار رکھنا ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ)) ''جس

نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی'' ((وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ))[1] ''اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی''۔ اب یہ chain چلی جائے گی۔ البتہ اب معروف کی شرط آپ سے آپ آ جائے گی۔ حضور ﷺ نے بھی کسی کو معین کیا ہو تو وہاں اطاعت فی المعروف ہو گی۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب قول الله تعالی: واطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامرمنکم۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة وتحریمها فی المعصیة۔

ایک صاحب کا واقعہ ملتا ہے کہ ان کو حضور ﷺ نے کسی دستے پر کمانڈر بنا کر بھیجا' وہ جلالی مزاج کے آدمی تھے' اپنے ساتھیوں سے کسی بات پر ناراض ہو گئے تو اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے انہیں بہت بڑا گڑھا کھودنے کا حکم دیا۔ ساتھیوں نے گڑھا کھود دیا۔ اب حکم دیا کہ اس میں لکڑیاں ڈالو۔ انہوں نے لکڑیاں ڈال دیں۔ حکم دیا کہ لکڑیوں کو آگ لگاؤ۔ انہوں نے آگ لگا دی۔ یہاں تک تو اطاعت ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ اس آگ میں کود جاؤ! اس پر وہ ٹھٹک کر کھڑے رہ گئے کہ اسی آگ سے بچنے کے لیے تو ہم نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا دامن تھاما' تو اس آگ میں ہم آپ کے حکم سے کیسے کود جائیں؟ بعد میں یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ انہوں نے ٹھیک کیا' اور اگر کہیں وہ اس آگ میں کود جاتے تو پھر آگ ہی میں رہتے۔ یعنی جہنم میں داخل ہو جاتے۔ آپ ﷺ نے اس کی توثیق اس لیے فرمائی کہ یہ حکم فی المعروف نہیں تھا' یہ تو منکر کا حکم تھا' خودکشی کا حکم تھا۔ ایسے حکم کی اجازت کسی صاحب امر کو نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا چاہے وہ حضور ﷺ کا مقرر کردہ امیر ہو لیکن اس کی اطاعت بھی فی المعروف ہو گی' مطلق نہیں ہو گی۔ مطلق اطاعت صرف محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ محمد ﷺ آخری انسان تھے جن کی اطاعت مطلق تھی' ان کے بعد کسی کی اطاعت مطلق نہیں ہے۔ ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی اطاعت مطلق نہیں ہے تو اور کس کی ہو گی؟

یہ بھی نوٹ کیجیے کہ بخاری و مسلم ہی کی بعض روایات میں لفظ ''اَمِیْرِیْ'' کے بجائے ''اَلْاَمِیْرَ'' ہے: ((وَمَنْ یُطِعِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ یَعْصِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ)) اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد امارت کو ایک ادارے (institution) کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ اب یہ تو نہیں ہے کہ ہر ایک کو امارت کا پروانہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہی سے ملے گا' بلکہ وہ نظم کہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی بجا آوری کے لیے قائم کیا جا رہا ہے' جس میں اصلاً اللہ اور اس کے رسولؐ کو مطاع مانا گیا ہے' اب اس میں جو بھی نصبِ امارت ہو گا اس کے ضمن میں یہ تیسری بات بھی پہلے سے مان لی گئی کہ ہم سمع و طاعت کی روش اختیار کریں گے خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے۔ اسی ''اَثَــــرة'' سے بابِ ''اِفعال'' میں لفظ ایثار بنا ہے۔ سورۃ الحشر میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ﴾ ''وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں''۔

آگے چوتھی بات بیان کی جا رہی ہے: وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ ''اور ہم صاحبِ امر سے جھگڑیں گے نہیں''۔ جو بھی ولاۃِ امر ہوں گے' جو جس سطح پر ہے' جس جگہ ہے' ہم اس کا حکم مانیں گے' اس سے امر میں جھگڑیں گے نہیں۔ اس کے بعد ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: ((اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللّٰهِ فِیْهِ بُرْهَانٌ)) اور یہ الفاظ حضور ﷺ کی طرف سے ہیں کہ: ''سوائے اس کے کہ تم دیکھو (صاحبِ امر کی طرف سے) کوئی کھلم کھلا کفر جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل موجود ہو''۔ یہ نہیں کہ ہمیں اختلاف ہے صاحب! ہم تو اس تعبیر کو تسلیم نہیں کرتے! جہاں بات تعبیروں کی یا تدبیروں کی ہو گی' جہاں مباحات کا دائرہ ہو گا وہاں آپ اختلاف نہیں کر سکتے۔ تمہارے پاس اس معاملے میں اللہ کی طرف سے کوئی دلیل قطعی ہو' کوئی ثبوت موجود ہو تب تو تم اطاعت سے سرتابی کر سکو گے' تب تم کوئی جھگڑا ڈال سکو گے' لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو معمولی اختلافات' تعبیر کے فرق یا تدبیر میں اختلافِ رائے کی بنیاد پر آپ کوئی جھگڑا پیدا کرنے کھڑے ہو جائیں تو یہ اس بیعت کے خلاف ہو جائے گا۔

بیعت کے اگلے الفاظ ہیں: وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ ''اور (ہم نے بیعت کی تھی) اس پر بھی کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں' اور ہم اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے''۔ ان الفاظ کے ذریعے عقیدت کی بنیاد پر سمع و طاعت میں غلو کا راستہ بند کر دیا گیا جس کے نتیجے کے طور پر شخصیت پرستی بر آمد ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اندھے' بہرے اور گونگے بن کر چلو' بلکہ تم اپنی رائے کو برقرار رکھو۔ اپنی سوچ اور عقل کے اوپر پہرے نہ بٹھاؤ' اس کو بروئے کار لاؤ۔ اللہ نے جو استعدادات دی ہیں' ان کو بھرپور طریقے پر استعمال کرو اور تمہاری جو رائے ہو اُس کے بیان کرنے میں کبھی بھی کوئی ہچکچاہٹ' کوئی جھجک' کسی کا رعب یا کسی کی عقیدت مانع نہ آئے۔ کسی ملامت کرنے والے کے خوف سے اپنی زبانوں پر تالے مت ڈالو!

نظم اجتماعی میں اظہارِ رائے کی حیثیت

یہیں وہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ نظم اجتماعی میں اظہارِ رائے کی حیثیت کیا ہے! دراصل اظہارِ رائے یا مشورہ دینا حق نہیں ہے بلکہ فرض ہے۔ تم اپنی رائے دو‘ مشورہ دو‘ اس کے بعد تم فارغ ہو‘ تمہاری ذمہ داری ادا ہو گئی۔ ہمارے یہاں حقوق پر توجہ بہت زیادہ ہے‘ جبکہ فرائض نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اصل میں تو ایک ہی لفظ کو آپ حق بھی کہہ سکتے ہیں اور فرض بھی کہہ سکتے ہیں۔ شوہر کا جو حق بیوی پر ہے وہی بیوی کا فرض شوہر کے ضمن میں ہے۔ اسی طرح بیوی کا جو حق شوہر پر ہے وہی شوہر کا فرض بیوی کے ضمن میں ہے۔ یہ حقوق و فرائض کا معاملہ ہے۔ لیکن آج جو ہمارا معاشرہ سارا تلپٹ ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حقوق کی بات سب کرتے ہیں‘ فرض کی بات کوئی کرنے کو تیار نہیں۔ اگر انسان کی توجہ ذرا فرائض کی طرف منعکس ہو جائے تو تمام معاملات درست ہو جائیں۔ لہٰذا اپنے فرائض ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں۔ کوئی حق اگر مارا بھی گیا تو اللہ کے ہاں اس کی تلافی (compensation) ہو جائے گی‘ فرض کے اندر کوتاہی ہو گئی تو کیا کرو گے؟ جواب دہی تمہاری ہو گی۔ اگر فریق ثانی نے تمہارا کوئی حق مار لیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں سارا لین دین ہو جائے گا۔ وہاں کی کرنسی نیکیاں اور بدیاں ہے‘ وہاں تو اعمال کا مبادلہ ہو گا‘ یعنی نیکیوں اور بدیوں کا۔ لہٰذا اس میں گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ گھاٹے کا سودا اس میں ہے کہ تم نے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی‘ اس کی جواب دہی اللہ کے ہاں کرنی پڑے گی۔ وہاں اپنی نیکیاں دینی پڑ جائیں گی اور ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی غلطیوں کا وبال تمہارے اوپر آ جائے۔ تو یہاں یہ نوٹ کر لیجیے کہ اسلامی نظمِ جماعت میں مشورہ دینا حق نہیں ہے‘ فرض ہے۔ آدمی فرض ادا کر کے فارغ ہو جاتا ہے۔ اب وہ یہ نہیں کہتا کہ لازماً میری بات مانی جائے۔ اپنی بات منوانے پر اصرار تو عبداللہ بن اُبی کا طرزِ عمل ہے۔ مشورہ دینے میں کوئی رکاوٹ (inhibition) پسندیدہ نہیں ہے۔ اس میں کسی کے روکنے کی وجہ سے یا کسی کے خیال اور لحاظ کی بنا پر رک جانا پسندیدہ نہیں ہے۔ تم بات کہو! کہنے کے بعد تم نے اپنا فرض ادا کر دیا‘ عنداللہ تم بری ہو گئے۔ اب معاملہ صاحبِ امر کا ہے۔ وہاں ووٹوں کی گنتی سے فیصلے نہیں ہوں گے۔ تنظیم کا وہ ڈھانچہ ہی مختلف ہوتا ہے جس میں کہ یہ سارا معاملہ ووٹوں کی گنتی سے وجود میں آتا ہے۔

آپ نے نوٹ کر لیا ہو گا کہ اس ایک حدیث میں اسلامی نظم جماعت کے جتنے بھی دستوری تقاضے ہیں ان کا حصر موجود ہے۔ میرے نزدیک تو یہ جوامع الکلم میں سے ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ الفاظ صحابہ کرام ؓ نے خود نہیں کہے ہوں گے‘ بلکہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائے اور ان میں حضور ﷺ نے نظم اور ڈسپلن کے اعتبار سے بیعت کرنے والوں کا اس طرح ”گھیراؤ“ کیا ہے کہ کہیں کوئی رخنہ باقی نہیں چھوڑا۔ معاذ اللہ‘ آپؐ کی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی۔ دین کا کام کرنا ہے تو اس کے لیے ایک مضبوط نظم والی جماعت چاہیے‘ ڈھیلا ڈھالا ادارہ نہیں چاہیے۔

نظم اجتماعی کا شعور اور صحابہ کرامؓ

صحابہ کرام ؓ کے اندر اس نظم کا شعور اِس قدر پیدا ہو چکا تھا کہ ہر شخص ہر وقت یہ نوٹ کرتا کہ اس وقت میں کس حیثیت میں ہوں اور دوسرا شخص کس حیثیت میں ہے۔ آیا ہم ہم مرتبہ (equi-status) ہیں اور کوئی تیسرا ہمارا امیر ہے‘ ہم دونوں اس کے تابع ہیں یا یہ کہ میں امیر ہوں اور یہ مأمور ہے‘ یا یہ کہ وہ امیر ہے‘ میں مأمور ہوں۔ نظم کے اعتبار سے یہ تین مختلف حیثیتیں ہیں‘ اور ایک انسان ہر معاملے میں‘ جو بھی اقدام وہ کر رہا ہے یا زبان سے جو بھی لفظ نکال رہا ہے‘ اس کا رویہ اگر اس شعور کے تحت نہیں ہو گا تو سارا نظم تہ و بالا ہو جائے گا۔ ایک نظم جماعت کے ساتھی ہونے کے اعتبار سے یقیناً سب برابر ہیں‘ لیکن جب امر قائم ہوا ہے‘ صاحب امر کا نصب ہو گیا ہے‘ اب وہ امیر ہے اور آپ مأمور ہیں۔ جیسے انسان ہونے کے ناتے مَرد و زن یقیناً برابر ہیں۔ شرفِ انسانیت کے اعتبار سے عورت گھٹیا نہیں ہے‘ لیکن جب ایک مَرد اور ایک عورت کے اندر رشتۂ ازدواج قائم ہوا ہے تو ان کے مابین محض مَرد اور عورت کی نسبت نہیں رہی‘ اب شوہر اور بیوی کی نسبت ہے۔ یہاں قرآنی ہدایت ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ (النساء:۳۴) کا اطلاق ہو گا۔ اب معاملہ بالکل بدل گیا‘ نوعیت تبدیل ہو گئی‘ نسبت اور ہو گئی! اسی طرح تمام رفقاء آپس میں برابر ہیں‘ لیکن جب کوئی صاحب امیر بنا دیے گئے تو اب امیر اور مأمور کی جو ایک نسبت قائم ہو جاتی ہے اس کا تعین ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس کی نمایاں ترین مثال جب پہلی مرتبہ میرے سامنے آئی تو عقل دنگ رہ گئی کہ حضور ﷺ نے ڈسپلن کا کیسا شعور پیدا کیا تھا!

مشہور واقعہ ہے کہ سن ۹ ھ میں حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو امیر الحج بنا کر قافلہ روانہ فرما دیا۔ قافلہ روانہ ہو چکا تھا کہ سورۃ التوبۃ کی ابتدائی چھ آیات نازل ہوئیں‘ جن میں تیسری آیت کے الفاظ یہ ہیں: ﴿وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖٓ اِلَی النَّاسِ یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ﴾ یعنی حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے یہ باتیں لوگوں کے سامنے بیان کر دی جائیں‘ ان کا اعلان (proclamation) ہو جائے۔ تو حضور ﷺ نے حضرت علی ؓ کو بھیجا کہ تم میرے نمائندے کی حیثیت سے اجتماعِ حج میں یہ آیات پڑھ کر سنا دو! اس لیے کہ یہ ایک انتہائی اہم اعلان تھا کہ مشرکین سے تمام معاہدے ختم ہو جائیں گے‘ کسی کا کوئی عہد نہیں رہے گا اور یہ بات کہ چار مہینے ختم ہوئے تو قتلِ عام بھی شروع ہو جائے گا۔ اصل میں مسلمان تو اپنے نظم کو جانتے تھے‘ لیکن ابھی جو لوگ دائرۂ اسلام سے باہر تھے وہ اس سے واقف نہیں تھے۔ وہ اپنی سابقہ روایت کے مطابق یہ سمجھ

سکتے تھے کہ یہ اعلان اسی صورت میں مؤثر (valid) ہے جبکہ حضورﷺ کا کوئی انتہائی قریبی رشتہ دار' اُن کے گھرانے کا کوئی فرد یہ اعلان کرے۔ تو گویا اپنے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے حضورﷺ نے حضرت علی ؓ کو بھیج دیا اور ان کے ذمے لگایا کہ اجتماعِ حج میں ان آیات کو پڑھ کر سنا دیں۔ جب حضرت علیؓ آئے تو حضرت ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور ان سے پہلا سوال یہ کیا کہ ''اَمِیْرٌ اَوْمَامُوْرٌ ؟'' یعنی مجھے پہلے یہ بتا دیجیے کہ آپ امیر کی حیثیت سے آئے ہیں یا مأمور کی حیثیت سے؟ مجھے اپنی حیثیت بھی معلوم ہونی چاہیے اور آپ کی حیثیت بھی۔ اگر حضورﷺ نے مجھے معزول کر کے آپ کو امیر بنایا ہے تو میں حاضر ہوں' امارت سنبھالیے! اور اگر ایسا نہیں ہے تو بھی مجھے معلوم ہونا چاہیے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: ''مَامُوْرٌ!'' یعنی میں امیر بنا کر نہیں بھیجا گیا' امیر آپ ہی ہیں' میں مأمور بنا کر بھیجا گیا ہوں' صرف ایک خاص کام میرے ذمے لگایا گیا ہے' وہ میں کروں گا۔ یہ ہے اس نظم اور ڈسپلن کا احساس!

اس نظم وضبط کو میں انقلاب کے معاملے میں مثال کے طور پر پیش کیا کرتا ہوں کہ محمدٌ رسول اللہﷺ کے برپا کردہ انقلاب میں یہ پہلو مثالی حیثیت کا حامل ہے۔ جس معاشرے میں کوئی نظم اور کوئی ڈسپلن نہیں تھا' جسے ''قَوْمًا لُّدًّا'' (جھگڑالو قوم) کہا گیا ہے' اس میں کون کسی کی بات سنتا تھا اور کون کسی کے سامنے سر جھکانے کو تیار ہوتا تھا۔ اس قوم میں ڈسپلن کا یہ احساس پیدا کیا! اسی کا مظہر تھا کہ حضرت ابوعبیدہ ؓ کو حضرت خالد ؓ کی جگہ پر کمانڈر مقرر کیا گیا تو حضرت خالد ؓ نے یہ نہیں کہا کہ اچھا جی' اب مجھے رخصت دیجیے' جو شخص میرے ماتحت رہا ہے میں اس کے ماتحت رہ کر اب کیسے کام کروں گا! اس لیے کہ محمدٌ رسول اللہﷺ نے جو تربیت کی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ ہر ایک کے پیشِ نظر یہی تھا کہ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے' خواہ امیر کی حیثیت سے ہو خواہ مأمور کی حیثیت سے۔ جس کو جو حکم ملا ہے اس کو وہ کام کرنا ہے' ہم اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے حاضر ہوئے ہیں' کسی پر احسان رکھنے کے لیے نہیں آئے۔ یہ ساری جدوجہد ہم اپنی عاقبت بنانے کے لیے کر رہے ہیں' ہم کسی اور کا جھنڈا اٹھانے کے لیے نہیں آئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی عاقبت بنانے کے لیے دین کو قائم کرنا ہماری ذمہ داری ہے اور اس کے لیے جدوجہد کرنا فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے اجتماعیت لازم ہے اور جماعتی حیثیت کے بغیر یہ کام ہو نہیں سکتا۔ اس کے لیے ایک ڈسپلن ہوگا' جس میں امراء کی اور مأمورین کی ایک chain ہوگی۔ ظاہر بات ہے کہ جب امیر اور مأمور کی یہ نسبت قائم ہوگی تو اس نسبت کا پھر جو بھی تقاضا ہوگا وہ پورا کیا جائے گا۔ لیکن سمع وطاعت کا یہ معاملہ شخصی نہیں ہوگا' بلکہ اس نظم کے اعتبار سے کسی شخص کی جو حیثیت ہے اسی درجے میں اس کی اطاعت ہو رہی ہے۔ یہ ہے وہ نظم جماعت جو آنحضورﷺ نے قائم کر کے دکھایا اور یہ ہے وہ بیعت کا نظام جو منصوص بھی ہے' مسنون بھی ہے اور مأثور بھی۔

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ رسول اللہﷺ مختلف مواقع پر اور بھی بیعتیں لے لیتے تھے۔ مثلاً کسی سے بیعت لی: ''عَلٰی نُصْحٍ لِکُلِّ مُسْلِمٍ''۔ یعنی اس بات پر کہ ہر مسلمان کی خیرخواہی کرو گے۔ اسی طرح آپؐ نے کہیں ہجرت کی بیعت' کہیں جہاد کی بیعت اور کہیں موت کی بیعت لی۔ کہیں یہ بیعت بھی لی کہ میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار نہیں کریں گے (عَلٰی اَنْ لَّا نَفِرَّ)(۱) تو حضورﷺ کے زمانے میں یہ بیعتیں ہوئی ہیں۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب استحباب مبایعۃ الامام الجیش عند ارادۃ القتال۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الجھاد والسیر' باب التحریض علی القتال و باب حفر الخندق۔ وصحیح مسلم' کتاب الجھاد والسیر' باب غزوۃ الاحزاب وھی الخندق۔

لیکن یہ جان لیجیے کہ اصل بیعتیں دو ہیں: ایک بیعت اسلام اور اس کے ساتھ بیعت ارشاد' اور دوسری بیعت جہاد اور بیعت سمع وطاعت۔ اس لیے کہ اس اجتماعیت کے لیے بیعت سمع وطاعت حضرت عبادہ بن صامت ؓ کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہے' جس کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا۔ نظم اجتماعی کے ضمن میں اس حدیث کو اصل ''منات'' کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی یہ وہ کھونٹا ہے جس کے گرد اجتماعیت کی چکی گھومتی ہے۔ اس حدیث کا تو ایک ایک لفظ ہم میں سے ہر شخص کو زبانی یاد ہونا چاہیے اور ان تقاضوں کا پورا شعور ہونا چاہیے' اس لیے کہ ہمیں اب اپنی اجتماعیت ہیئت کو بالکلیہ اس پوری حدیث کے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اب بالکلیہ اسی بیعت کے نظام پر اپنے پورے ڈسپلن کو اور اپنے پورے ڈھانچے کو کھڑا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

آج کے اس درس کو میں اس شعر پر ختم کر رہا ہوں جو متفق علیہ روایات کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھودتے ہوئے پڑھ رہے تھے:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا (۲)

''ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے محمدﷺ سے جہاد کی بیعت کی۔ اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک ہمارے جسم وجان کا رشتہ برقرار ہے''۔

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالایات والذکر الحکیم